بحث ونظر

شاہ ولی اللہؒ کا نظریۂ اِرتفاقات - ایک مطالعہ

—————— ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

ارتفاق کے چار مراحل:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۳ء) نے اپنے عمرانی افکار و نظریات کو ''نظریۂ ارتفاقات'' میں پوری طرح سمیٹ دیا ہے۔ یہ نظریہ انسانی زندگی اور اس کی سماجی وعمرانی تشکیل کے چار ارتقائی مراحل کی تعبیر وتشریح سے عبارت ہے۔ معاشرہ کی ارتقائی تشکیل پر اس سے پہلے دوسرے حکمائے اسلام بھی گفتگو کر چکے ہیں۔ ابونصر الفارابی (م ۹۵۰ء) جنھیں 'معلّم ثانی' کا خطاب ملا، اپنی تصنیف آراء أهل المدینة الفاضلة' میں مثالی ریاست اور مثالی معاشرہ کے تدریجی ارتقا پر مفصل بحث کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ فطرت انسانی کے تقاضوں کی تکمیل اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ بڑی بڑی انسانی جماعتیں اور گروہ یکجا ہوکر ایک دوسرے سے تعاون نہ کریں اور انسانی ضروریات کی تکمیل میں ایک دوسرے کی مدد نہ کریں۔ وہ انسانی معاشرہ کی دو بڑی قسمیں قرار دیتے ہیں کامل اور غیر کامل۔ غیر کامل سے مراد وہ معاشرہ ہے جو کسی خاندان، محلّہ، گاؤں کے افراد پر مشتمل ہوتا ہے، جب کہ کامل معاشرہ کی مزید تین قسمیں ہیں: عظیم، متوسط اور محدود۔ ایک سے زیادہ اقوام پر مشتمل عظیم معاشرہ کہلاتا ہے، جب کہ ایک قوم پر مبنی معاشرہ کو متوسط معاشرہ کہا جاتا ہے۔ محدود یا صغریٰ معاشرہ ایک شہر کے باشندوں پر مشتمل ہوتا ہے [1]

'اِرتفاق' کا مادہ رفق ہے جس کے معنیٰ نرمی اور کسی چیز سے مدد لینے کے ہیں۔ اس سے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مراد وہ نفع بخش تدابیر ہیں جو انسانی زندگی

کے لوازمات میں سے ہیں۔[۲] مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) کے بقول ارتفاق سے شاہ صاحب کی مراد افراد کا ایک دوسرے سے جائز انتفاع، تعاون، اشتراکِ عمل اور معتدل و متوازن زندگی کے قیام کے لیے 'تدبیراتِ نافعہ' ہیں۔[۳] چناں چہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

من عناية الله سبحانه بالإنسان أن خلق الإنسان مدني الطبع لايتم ارتفاقه إلا بصحبة بني نوعه واجتماعهم وتعاونهم.[۴]

(یہ اللہ کی خصوصی عنایت ہے کہ اس نے انسان کو طبعاً مدنیت پسند پیدا کیا جس کا تعامل اور انتفاع اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ وہ بنی نوع کی رفاقت اختیار کرے اور ان کے ساتھ گھل مل کر رہے اور اُن سے تعاون کرے)

شاہ صاحب نے انسانی معاشرہ کے اس تدریجی ارتقا کو چار مرحلوں میں تقسیم کیا ہے۔ ارتفاقِ اوّل سے اُن کی مراد معاشرہ کی تشکیل کا پہلا درجہ ہے، جس میں انسان نے زبان تخلیق کی، زراعت و فلاحت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ رہائش کے لیے مکان اور ستر پوشی کے لیے لباس ایجاد کیے۔ خوراک، مکان، لباس، برتنوں کا استعمال اور بقائے نسل کا اہتمام بنیادی انسانی ضروریات میں شامل ہیں۔[۵] اس مرحلہ میں انتہائی سادہ اور بدوی تہذیب کارفرما ہوتی ہے اور اس میں مختلف مقامات اور معاشروں میں نسبۃً زیادہ یکسانیت پائی جاتی ہے، کیوں کہ یہ ارتفاق اقوام و قبائل کے لیے زیادہ قابلِ قبول ہوتا ہے۔[۶]

ارتفاق دوم میں معاشرہ کے تجربات، اخلاقِ فاضلہ، حسنِ معاشرت اور رفاہ عامّہ کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر ارتفاقِ اول کو ترقی دی جاتی ہے۔ تدبیرِ منزل اور مختلف پیشوں کا قیام عمل میں آتا ہے۔ اس مرحلہ میں اُن آداب اور قواعد و ضوابط سے سابقہ پڑتا ہے جو اکل و شرب، نشست و برخاست، سفر و حضر، خلوت و جلوت، لباس و رہائش، صفائی و آرائش، تکلم و مباحثہ، دواؤں کے استعمال، منتر اور جھاڑ پھونک، پیش گوئی کی کام یاب یا ناکام کوشش، خوشی و غمی کی تقریبات اور مواقع وغیرہ سے متعلق

ہیں۔ے یہ دوسرا مرحلہ ہر شعبۂ زندگی کے صحت مند تجربات اور ترقی یافتہ انتفاع و اشتراک پر منحصر ہوتا ہے، جس میں ضرر سے دور اور نفع سے قریب کیفیات و حالات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ نفع و نقصان کا یہ فیصلہ فرد کے نہیں، بلکہ اجتماعیت کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے۔ اگر کسی اقدام و عمل میں فرد کا مفاد کارفرما ہو، مگر معاشرہ کو اس سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اُس کا ترک کرنا لازم ہوگا۔ اس ارتفاق میں معاشرہ کے رہنما افراد اور کلی و اجتماعی رائے اور لطیف مذاق کے حامل افراد کی رہنمائی اہم ہوجاتی ہے اور ان افراد کا اجتماع عام طور پر قصبات اور شہروں میں ہوتا ہے، جہاں نت نئی تدابیر اور طریقے وجود میں آتے ہیں اور ارتفاق و انتفاع کی اعلیٰ و احسن شکلیں دیکھنے ملتی ہیں۔۸ شاہ صاحب کے نزدیک اس دوسرے مرحلہ میں پانچ حکمتیں بڑی اہم ہیں: معاشی حکمت، اکتسابی حکمت، حکمتِ منزلیہ، حکمتِ معاملات اور حکمتِ تعاونِ باہمی۔ معاشی حکمت میں آدابِ اکل و شرب، رہائش و آرائش، جنسی تلذذ اور آفات و امراض وغیرہ شامل ہیں۔۹ اکتسابی حکمت میں صنعت و حرفت کی مختلف اقسام داخل ہیں۔ منزلی حکمت میں حقوق الزوجین، تعلیم و تربیتِ اولاد، غلاموں کے مسائل اور صحبت و رفاقت کے اصول شامل ہیں۔ معاملات کی حکمت لین دین کے قواعد، خرید و فروخت، ہبہ و اجارہ، قرض و رہن کے ضوابط سے بحث کرتی ہے، جب کہ چوتھی حکمت میں کفالت و مضاربت، شرکت، وکالت اور اجارہ طلبی کے معاملات موضوعِ بحث بنتے ہیں۔۱۰

ارتفاقِ سوم انسانی معاشرہ کی ترقی پذیر وہ شکل ہے جس میں ایک ریاست قائم ہوجاتی ہے۔ صنعت و حرفت کے ادارے منظم و مستحکم ہوجاتے ہیں۔ امدادِ باہمی اور تعاون عروج پر ہوتا ہے۔ کسبِ معاش کے طریقوں کی بہترین تنظیم ہوتی ہے اور تعاون و تکامل کی کارفرمائی کی بنا پر پورا معاشرہ گویا عضوِ واحد بن جاتا ہے۔ اسی طرح کے معاشرہ کو ہم ریاست کہتے ہیں۔ ریاست دراصل شہر، فصیل اور قلعہ کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ تو باہمی رابطہ اور اشتراکِ عمل کی وجہ سے وجود میں آتی ہے، حتیٰ کہ اگر چھوٹی چھوٹی بستیاں ہوں مگر اُن میں قربت و یگانگت اور تعاون و تکامل کی روح کارفرما ہو تو ہم اُسے

بھی ریاست کہیں گے۔ اسی ربطِ باہم کی وجہ سے ریاست شئی واحد میں بدل جاتی ہے اور اُس بستی کا ہر گھرانہ اور ہر گروہ ایک جسم کے عضو کی مانند ہو جاتا ہے۔[۱۱]

اس مرحلہ میں ارتفاق و انتفاع بہتر انداز میں اور مطلوب شکل میں اُسی وقت ممکن ہوگا جب کہ سارے افراد ایک عادلانہ قانون کے پابند ہوں اور اُس کی خلاف ورزی کی تاب نہ رکھتے ہوں۔ پابندیٔ قانون اور اطاعتِ امر کے لیے ناگزیر ہوگا کہ ایک فرد ایسا ہو جس کی فرماں برداری پر جمہور اربابِ حل وعقد آمادہ ہوں اور جس کے پاس اتنی قوت وشوکت اور اعوان و انصار کی تعداد موجود ہو کہ وہ افرادِ ریاست سے قانون کی پیروی کرا سکے، باغیوں اور مجرموں کی سرکوبی کر سکے اور بزورِ امن و قانون قائم رکھ سکے۔[۱۲] شاہ صاحب اس امر کی صراحت بھی کرتے ہیں کہ ارتفاقِ سوم کا اصل مقصد ریاست کی صحت مند وحدت کی حفاظت اور اس کے منافع کی بدرجۂ احسن تکمیل ہے، جو امام کے بغیر درحقیقت ممکن نہیں۔ اور امام سے مراد اُن کے نزدیک کوئی انفرادی انسان نہیں بلکہ وہ نظام ہے جو اس طرح کی ریاست میں بتدریج ابھر کر سامنے آتا ہے۔[۱۳] فاضل مصنف نے ان مقاصد کے حصول کے لیے ریاست میں پانچ شعبوں کی تنظیم ناگزیر قرار دی ہے:

۱- صیغۂ عدلیہ، جو ریاست میں پیدا ہونے والے تنازعات و اختلافات کو قانون کی روشنی میں طے کرے۔

۲- صیغۂ شہر یاریت، جو مدنیت و ریاست کو ضرر پہنچانے والے عناصر کا احتساب کرے اور امن و قانون کو ہمیشہ برقرار رکھے۔

۳- صیغۂ جہاد، جو باغی اور مفسد قوتوں کا خاتمہ کرے۔

۴- صیغۂ تولیت، جس کے ذمہ تجارتی منڈیوں اور بازاروں کا قیام، قلعوں اور سرحدی چوکیوں کی تعمیر، زراعت وفلاحت کا اہتمام اور مظلوم و کم زور طبقات کا تحفظ ہوگا۔

۵- صیغۂ وعظ و ارشاد، جو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ تبلیغِ دین کا فریضہ انجام دے گا۔

ارتفاقِ چہارم انسانی معاشرہ کے ارتقا کا وہ نقطۂ کمال ہے جہاں ارتفاقِ سوم

کے مرحلہ میں قائم ہونے والی مختلف وحدتوں اور سیاسی وعمرانی اکائیوں کے مابین اتحاد قائم کرنے کے لیے حاکمِ اعلیٰ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب مختلف ریاستیں ارتفاق و انتفاع کے لیے مصروفِ کار ہوں گی تو اُن کے درمیان مفادات کا تناؤ اور فکر وعمل کی کشاکش ہوگی جو باہم جدال وقتال تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ اس صورت میں انھیں وحدت و سالمیت کی لڑی میں پروئے رکھنے کے لیے اور تمدنی وعمرانی لوازم کی تکمیل کے تحفظ کے لیے ایک مقتدرِ اعلیٰ کا وجود ناگزیر ہوگا جو خلافتِ عظمیٰ کو اس کے تمام تقاضوں سمیت قائم کر سکے۔ اسی ادارہ کو ہم مذہب کی اصطلاح میں ''خلیفہ'' کہتے ہیں۔ ۱۵ بلکہ ایک دوسرے مقام پر شاہ صاحب اسے 'خلیفۃ الخلفاء' کا نام دیتے ہیں جو اتنا صاحبِ سطوت، باجبروت، پرشکوہ اور صاحبِ اقتدار ہو کہ بزورِ شمشیر ایسے اقتدار سے محروم کرنا کسی دوسرے فرد یا گروہ کے لیے ناممکن ہو۔ ۱۶

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نظریۂ ارتفاقات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خمیر میں دو بنیادی اصول کارفرما ہیں: ایک اصول ہے فطرتِ انسانی سے اس کی ہم آہنگی، اور دوسرا اصول ہے اس کا الہامی ہونا۔ وہ صراحت کرتے ہیں کہ انسانی معاشرہ کے مرحلہ وار ارتقا کا یہ عمل فطری ہے یعنی تمام اقوام وقبائل اور مذاہب وادیان کے حاملین میں یہی فطری ارتقا رونما ہوگا۔ ترقی کی رفتار میں کمی بیشی ہوسکتی ہے، مگر ترتیب یہی ہوگی، کیوں کہ اس کے علاوہ کوئی اور ترتیب ممکن ہی نہیں ہے۔ ہاں اس کا امکان ہے کہ اصولی باتوں میں اتفاق ہونے کے بعد تفصیلات میں اختلاف اور جزوی اور ثانوی مسائل میں ایک دوسرے سے فرق ہو، مثال کے طور پر ارتفاقِ اوّل کے مرحلہ میں مبادی و کلیات پر اتفاق عام ہونے کے باوجود یہ عین ممکن ہے کہ علوم طبیعیہ سے لگاؤ رکھنے والا طب کے محاسن پر توجہ دے، نجومی ستاروں کے خواص پر گیان دھیان کرے اور روحانیت کی طرف مائل فرد احسان کے مقامات پر مرتکز ہوجائے، کیوں کہ ہر قوم کے اپنے کچھ آداب ورسوم اور روایات ہوتی ہیں جو اُن کی شناخت بن جاتی ہیں اور اس سے مزاجوں میں کسی قدر تنوع پیدا ہوجاتا ہے، مگر اصولی اور بنیادی باتوں میں وہ سب یکساں طور پر متفق ہوتی ہیں۔ ۱۷

ارتفاق کے اس ارتقائی عمل کو شاہ صاحب الہامی قرار دیتے ہیں، یعنی ان تمام مراحل میں انتفاع کا یہ جذبہ اور خواہش جبلّی و فطری اور خدا کی ودیعت کردہ ہے، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ کسی دور دراز صحرا یا جنگل میں اگر کوئی آدمی پیدا ہو اور وہاں اس نے دوسرے انسانوں کو ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے نہیں دیکھا تب بھی وہ انہی اصولی و مراحلِ ارتفاقات کے تحت زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوگا اور تمدنی زندگی کے جملہ لوازم رفتہ رفتہ اس کی راہ متعین کرتے چلے جائیں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ارتفاق کا یہ عمل موروثی نہیں، بلکہ الہامی ہے۔ ۱۸

ارتفاق کی فطری و انسانی ترجمانی:

شاہ صاحب کا یہ نظریۂ ارتفاقات مذہب اور وحی الٰہی کے کسی حوالہ کے بغیر تشکیل پاتا اور ارتقا کے تمام مراحل طے کرتا نظر آتا ہے، اس لیے کہ اس کی تعبیر و تشریح میں فاضل مصنف قرآن کا حوالہ دیتے ہیں نہ احادیث نبویہ کا۔ اس نظریہ کی بنیاد وہ مذہب پر رکھتے ہی نہیں بلکہ فطرت اور انسانیت کو اصل عامل اور محرک مان کر اس کی ایسی ترجمانی کرتے ہیں جو تمام مذاہب کے علم برداروں کے لیے قابل قبول ہو۔ البتہ اس ترجمانی و تشریح میں خدا کی کارفرما قوت کو محرک اولین قرار دے کر لامذہبیت اور خدا بیزاری سے بھرپور اجتناب کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'تاویل الأحادیث' میں ایک مقام پر کہتے ہیں:

ومنها أن رزقهٗ الله فطنة يعرف بها الارتفاقات من آداب المعيشة وتدبير المنزل والمعاملات وسياسة المدينة وسياسة الأمة فعرف المصالح التي يجري القوم فيها. ۱۹

(اللہ نے ہر انسان کو ذہانت سے نوازا ہے جس سے وہ ان تمام ارتفاقات سے واقف ہوجاتا ہے جن کا تعلق آدابِ معیشت، تدبیرِ منزل، تنظیمِ معاملات، ریاست کے سیاسی مسائل اور امت کی سیاسی پالیسیوں سے ہے۔ چناں چہ وہ اُن مصالح و مفادات سے آشنا ہوجاتا ہے جن کا رشتہ قوم سے ہوتا ہے)

یہ شاہ صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ وہ مذہب میں نہیں، پورے نظام انسانی میں الہام کی کارفرمائی کی ترجمانی کرتے ہیں، مگر اس کی ایسی دل نشیں عقلی تشریح کرتے ہیں کہ عمرانیات کا مابعد الطبیعیات سے تعلق قائم رکھتے ہوئے اور انسان اور خالق کے درمیان دائمی رشتہ برقرار رکھتے ہوئے اُس پر مذہب کے بجائے فطرت و جبلّت کی گہری چھاپ ڈالنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا یہ نظریۂ ارتفاقات قرآن کریم کی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا، یا انھوں نے اسلام سے ہٹ کر دوسرے افکار وتصورات کی ترجمانی کی ہے۔ اُن کی دوسری تحریریں اس حقیقت کا برملا اعلان و اعتراف کرتی ہیں کہ دین اسلام انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور وہ تمام عقلی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ وہ اس نظریہ کے ذریعہ غیر محسوس طریقے سے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ دین اسلام ہی عمرانی تقاضوں کے مطابق ہے۔ اُن کے دور میں ہر چیز کو عقل کی میزان میں پرکھنے کا جو خطرناک فتنہ پنپ رہا تھا اُس پر تنقید کرتے ہوئے خود کہتے ہیں:

إنّ المبتدعین شککوا فی کثیر من المسائل الإسلامیة بأنها مخالفة للعقل وکلّ ماهو مخالف لهٗ یجب ردُّه أو تاویلُه. ۲۰

اہل بدعت نے بہت سے اسلامی مسائل میں تشکیک پیدا کردی ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہیں اور ہر خلافِ عقل بات کی تردید یا اس کی تاویل ضروری ہے

شاہ صاحب اس تشکیک اور فتنہ پروری کے استیصال کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ احکام شریعت کے مصالح کو کھول کھول کر بیان کیا جائے اور اس کے اصول وقواعد اسی طرح وضع کیے جائیں جس طرح حکمائے اسلام نے یہود ونصاریٰ اور دہریوں وغیرہ کے مناظروں اور مذہبی جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے کیا تھا۔ ۲۱

معجزاتِ نبوی سے استدلال:

وہ دینِ اسلام کو فطرت کی عین پکار اور انسان کی عمرانی ضروریات اور سماجی و

تہذیبی تقاضوں کی تکمیل کا واحد ذریعہ ثابت کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ کے دو بڑے معجزات پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ یہ دونوں معجزے عقلی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے، ایک قرآن کریم اور دوسرا شریعتِ مطہرہ۔ وہ قرآن کریم کے اِس معجزانہ پہلو پر زور دیتے ہیں کہ اس کی تعلیمات حیرت انگیز اور تا قیامت بدلتے ہوئے حالات میں منارۂ نور ہیں:

وازاں جملہ وجہے ست کہ جز متدبرین دراسرار شرائع را فہم آں میسر نیست وآن آنست کہ ایم علوم خمسہ نفس اینہا دلیل بودن قرآن نازل من اللہ بجہت ہدایت بنی آدم است۔ ۲۲

معجزہ کا ایک پہلو اور ہے اور اسے اسرار شریعت پر غور وفکر کرنے والوں کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ قرآن کریم کے علوم پنج گانہ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے اور بنی آدم کی ہدایت کے لیے وحی ہوئی ہے۔

آگے فرماتے ہیں:

ہم چنیں چوں عالم اسرار شرائع می داند کہ در تہذیب نفوس کدام چیز با فراد انسان مے تواں القا نمود، بعد ازاں در فنون خمسہ تامل می کند بے شک در می یا بد کہ ایں فنون در معانی خود بوجے واقع اند کہ ازاں بہتر صورت نہ بندد۔ ۲۳

اسی طرح اسرارِ شریعت کا ماہر چوں کہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ تہذیبِ نفس اور اصلاحِ تعلیم وتفہیم ضروری ہے، اس لیے جب وہ قرآن کے فنون خمسہ پر تدبر کرتا ہے تو اسے اس حقیقت کو ماننے میں کوئی تامل نہیں رہتا کہ یہ علوم وفنونِ خمسہ جس انداز میں پیش کیے گئے ہیں اُس سے بہتر صورت ممکن نہ تھی

اس لیے علامہ شبلی نعمانیؒ (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) اِس قرآنی خدمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''قرآن مجید کے متعلق سب سے بڑا نکتہ، جو تمام قدماء سے رہ گیا تھا

اور جس کو شاہ صاحب نے ظاہر کیا، یہ تھا کہ تمام لوگ قرآن مجید کو صرف فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ سمجھتے آئے تھے۔ یہ کسی کو خیال نہ آیا کہ قرآن مجید کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ اخلاق، تزکیہ نفس، توحید، رسالت اور معاد کے جو حقائق قرآن میں مذکور ہیں طاقتِ بشری کی دسترس سے باہر ہیں۔" [۲۴]

نبی کریم ﷺ کا دوسرا بڑا معجزہ شریعتِ مطہرہ ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ فطری تقاضوں کی بدرجۂ اتم تکمیل کرتی اور انسانوں کے تمام طبقوں کے مفادات کی رعایت و حفاظت کرتی ہے۔ اس حقیقت کا اثبات شاہ صاحب نے عقلی انداز میں کیا ہے اور یہی ان کا نمایاں کمال ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ امت کے اربابِ علم وتفقہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ شریعت کے اعجاز کو واضح کریں، اس کی حکمتوں اور مصالح کی تشریح کریں اور یہ بتائیں کہ اقوامِ عالم کی فلاح وسعادت اور ان کے مفادات ومصالح اسی شریعت کی مخلصانہ پیروی میں مضمر ہیں:

فلما انقضیٰ عصرهم وجب أن یكون فی الأمة من یوضّح وجوه هٰذا النوع من الإعجاز والآثار الدالة علیٰ أن شریعته ﷺ أكمل الشرائع وانّ إتیان مثله بمثلها معجزة عظیمة كثیرة مشهورة لاحاجة إلیٰ ذكرها۔ [۲۵]

جب اسلاف کا دور گزر گیا تو امت میں ایسے افراد کا اٹھنا ضروری ہوگیا جو معجزہ کی اس نوعیت کے پہلوؤں کو واضح کریں اور ان آثار کو مبرہن کریں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت سب سے مکمل شریعت ہے اور اس شریعت کا نزول بہت بڑا اور بہت مشہور معجزہ ہے۔

فاضل مصنف یہ ثابت کرتے ہیں کہ انبیاء کرام کی آمد کا ایک مقصد ارتفاقات کی اصلاح وتہذیب ہے اور اس طرح بعثتِ انبیاء اور عمرانی ارتقا میں ایک مضبوط تعلق اور گہرا نظم پیدا ہوجاتا ہے:

وإن مراد الأنبياء عليهم السلام اصلاح ماعندهم من الارتفاقات فلا يعدل عنها إلىٰ مايباين المألوف الاّ ماشاء الله وانّ مظان المصالح تختلف باختلاف الأعصار والعادات ولذلک صحّ وقوع النسخ. ۲۶

انبیائے کرام کی بعثت کا ایک مقصد اپنی قوم میں رائج ارتفاقات کی صورتوں کی اصلاح کرنا ہے۔ وہ عام طور پر معروف و مانوس سے متصادم طریقے اختیار نہیں کرتے، الّا یہ کہ ناگزیر ہو۔ اور یہ کہ مصالح و مفادات کی سوچ میں زمانہ اور عادات و رسوم کے بدلنے سے فرق ہوجاتا ہے اسی لیے نسخ احکام درست ہے۔

شریعتِ محمدی کے مقاصد:

اپنی تصنیف البدور البازغۃ میں شاہ صاحب نے شریعتِ محمدی کے جو چار مقاصد بیان کیے ہیں اُن سے بھی بعثتِ نبوی اور نظامِ ارتفاقات میں گہری ہم رشتگی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بنی نوع انسان میں رائج نظام ارتفاقات سے سب سے زیادہ مطابقت اور ہم آہنگی شریعت محمدی رکھتی ہے، کیوں کہ اس شریعت کا مقصدِ اوّل ارتفاق ثانی کی اصلاح کرنا ہے، کیوں کہ اقوامِ عالم میں اور خاص طور سے اقوامِ عرب میں یہی ارتفاق رائج تھا اور اس میں بہت سی خرابیاں داخل ہوگئی تھیں جن کی درستی آپؐ کے پیش نظر تھی۔ اللہ کے رسول نے اس ارتفاق کو درست کیا اور اس کی کجی دور کی۔ اس عمل میں آپ نے انسانی خصوصیات اور تجربی علوم کو بنیاد بنایا اور خدا کی تعظیم کا رنگ اس پر غالب رکھا۔

شریعتِ محمدی کا مقصدِ دوم معاشرتی رسوم کی اصلاح ہے، تاکہ توجہ و انابت الٰہی سے انھیں ہم آہنگ بنادیا جائے اور ربانی طریقہ سے کوئی تصادم نہ رہے، عوام کے لیے وہ نفع آور ہوں اور اُن میں وسعت اور کشادگی ہو۔ لوگ اُن سے تنگی اور ضرر محسوس نہ کریں۔

مقصدِ ثالث ارتفاق سوم کا قیام و استحکام ہے، تاکہ ہر مظلوم کی اشک شوئی ہو،

فتنہ و فساد سے بندگانِ خدا کو محفوظ رکھا جائے، لوگوں کے تنازعات عدل کے ساتھ حل ہوں اور ظالموں اور مفسدوں کی سرکوبی ہو جائے۔ ۲۷

شریعتِ محمدی کا چوتھا مقصد ارتفاق رابع کے تحت دینِ اسلام کا غلبہ اور دوسرے ادیان و مذاہب پر اس کا استیلاء ہے۔ یہ غلبہ اس حد تک مکمل ہو کہ روئے زمین پر کوئی اس کی مزاحمت کرنے والا موجود نہ رہے۔ ۲۸

دینِ اسلام کے غلبہ کا ایک راستہ، شاہ صاحب کے نزدیک مخالفین سے جہاد ہے۔ ۲۹

غلبۂ دین کا دوسرا راستہ دلیل و برہان کا ہے، تاکہ عقل و دماغ کو مطمئن کیا جائے اور لوگوں کو اسلام کی صداقت و حقانیت پر شرحِ صدر ہو سکے۔ شاہ صاحب اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وجب أن يثبت بأمور برهانية أو خطابية نافعة في أذهان الجمهور أن تلك الأديان لاينبغي أن تتبع لأنها غير مأثورة عن المعصوم أو أنها غير منطبقة على قوانين الملّة أو أن فيها تحريفاً ووضعاً للشئ في غير موضعه ويصحّح ذلك على رؤس الأشهاد ويبيّن مرجحات الدين القويم من انّه سهلٌ سمحٌ وأن حدوده واضحة يعرف العقل حسنها وأن ليلها نهارها و أنّ سننها أنفع للجمهور. ۳۰

واجب ہے کہ صحیح عقائد کو دلیل و برہان کے ذریعہ یا نفع بخش خطابی اسلوب میں ثابت کیا جائے۔ عوام کے ذہنوں میں یہ حقیقت راسخ کی جائے کہ دوسرے مذاہب قابلِ اتباع نہیں ہیں، کیوں کہ وہ کسی معصوم شخصیت سے منقول نہیں ہیں یا قوانینِ ملت پر اُن کا انطباق نہیں ہوتا اور یہ کہ ان میں تحریف ہوگئی ہے، ایک شی کو اس کے نامناسب محل میں رکھ دیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کی تصحیح علانیہ ہو اور دین کی ترجیحات واضح کی جائیں کہ یہ آسان ہے اس میں بڑی وسعت ہے۔ اس کی حدود واضح ہیں جن کے حسن کو عقل دن کی روشنی میں دیکھ اور پرکھ سکتی ہے اور اس کے قوانین عوام کے لیے بڑے مفید ہیں۔

ارتفاق اور تقرّبِ الٰہی:

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نظامِ ارتفاقات کی طرح تقربِ الٰہی کے جذبہ کو بھی فطری اور الہامی مانتے ہیں۔ چنانچہ البدور البازغہ میں فرماتے ہیں کہ ''ارتفاقات کا نظام اور بطورِ خاص ارتفاق دوم وسوم پر نظامِ انسانی کی بنیاد استوار ہے اور یہ محض عنایتِ خداوندی کے طفیل میں نوعِ انسانی کو عطا ہوا ہے۔ اسی طرح تقربِ الٰہی کے جذبات بھی انسانی طبیعتوں میں ودیعت کردہ ہیں، خاص طور سے عبادت گزاری، احسان اور برائیوں سے بچنے کا داعیہ ہر فردِ بشر میں فطری طور سے موجود ہے''۔ ۳۱

ارتفاق اور تقرّب کے حسین امتزاج سے صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ شاہ صاحب تقرب سے بے نیاز ہوکر ارتفاق کے پرورش پانے والے عمل کو حیوانیت قرار دیتے ہیں اور ارتفاق سے کٹ کر تقرب کی زندگی بسر کرنے کو رہبانیت سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پوری انسانیت ارتفاق وتقرب کے اصولی مسائل میں متفق ہے۔ اگر اختلاف ہے تو اُن کے حصول کے طریقوں میں ہے۔ اس سے وہ نظام تشکیل پاتا ہے جسے فاضل مصنف 'ملّت' کا نام دیتے ہیں۔ جب معاشرہ کسی ملّت میں ڈھل جاتا ہے تو ارتفاق وتقرب کا بیک وقت حصول آسان ہوجاتا ہے۔ تشکیل امت کا یہ جذبہ بھی انسانوں کے اندر ودیعت کردہ ہے:

وأما الداعية المودعة في أصل طبائعهم فهي انقيادهم لأصول الارتفاقات والاقترابات من قبل فطرتهم. ۳۲	ان کی طبیعتوں اور مزاجوں میں پوری طرح یہ بات راسخ کردی گئی ہے کہ وہ اپنی فطرت کے دباؤ میں ارتفاق اور تقرب کے بنیادی اصولوں کی پیروی کریں۔

ارتفاق اور تقرب کے بہترین تعامل کے لیے ضروری ہے کہ کردار سازی ہو، اُن کی اصلاح اور تزکیہ ہو اور معاشرہ کے ہر فرد کی اخلاقی نشوونما ہو، تاکہ ایک صالح تہذیب وجود میں آئے۔ کردار سازی کے عمل میں شاہ صاحب چار بنیادی اخلاقی

صفات کو اساس مانتے ہیں، طہارت، اِخبات، سماحت اور عدالت۔ ان صفاتِ اربعہ کو تہذیبِ نفس اور اصلاح کے عمل میں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ تمام انبیاء ان ہی کی تعلیم وتربیت کے لیے بھیجے گئے اور تمام شریعتوں میں اِن ہی پر زور رہا۔[۳۳]

طہارت سے بدن کی صفائی کے ساتھ فکر کی طہارت بھی مراد ہے۔ شاہ صاحب اسے غسل و وضو کے اندر محصور نہیں مانتے، بلکہ ان کی روح اور ان کے مقصد پر بھی زور دیتے ہیں: ''اور اس سے مراد وہ سرور وانبساط اور فرحت و بشاشت ہے جو وضو و غسل کے بعد پیدا ہوتی ہے''۔[۳۴]

اِخبات سے مراد عاجزی وفروتنی، خشوع وخضوع، انکسار وافتادگی کی وہ کیفیت ہے جو خدا کی بارہ گاہ میں سرِ تسلیم خم کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان جب خدا کے جمال وجلال کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس پر حیرت و دہشت طاری ہوتی ہے اور پھر تذلّل اور نیازمندی کی کیفیت اسے گھیر لیتی ہے۔[۳۵]

سماحت سے مراد ضبطِ نفس کا وہ مرحلہ ہے جس میں انسان قوتِ بہیمیہ کے جذبات ومحرکات کے سامنے سپر انداز نہیں ہوتا اور اس کے نقصانات اور فتنوں سے محفوظ رہتا ہے۔[۳۶] سماحت کے لغوی معنیٰ کشادہ دلی، فیاضی اور دریادلی کے ہیں۔ یہ صفت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ نفس کے حیوانی تقاضوں پر آدمی کو قابو حاصل ہو اور وہ ملکوتی صفات کی طرف پیش قدمی کرتا رہے۔

عدالت سے مراد وہ نفسی قوت اور ملکہ ہے جس سے ایسی سرگرمیاں اور اقدامات جنم لیتے ہیں جن سے نظامِ تمدن کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔[۳۷]

ان صفاتِ اربعہ کے اثرات انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ طہارت کے نتیجے میں فکری تطہیر ہوتی ہے اور اس سے ملنے والی فرحت ولذت، سرور وانبساط سے معاشرہ بھی مستفید ہوتا ہے۔ اِخبات سے جو انفرادی عاجزی وفروتنی نمودار ہوتی ہے اُس کے بطن سے معاشرہ میں اخوت ومساوات، احترامِ انسانیت کو فروغ ملتا ہے۔ سماحت کے نتیجے میں معاشرہ خودغرضی وانا پرستی، حرص وبخل، انتقام وکینہ پروری سے محفوظ رہتا

ہے اور صبر و تحمل، عفو و کشادہ دلی، رواداری و تکریم انسانیت، ایثار و قناعت کے اوصاف کا معاشرہ میں چلن ہوتا ہے اور صفت عدالت کا مظاہرہ تو معاشرہ ہی میں ہوتا ہے۔

شاہ صاحب افراد کو اُن اخلاق عالیہ سے سرفراز کرتے ہیں جن سے صالح عمران اور نفع آور تمدن وجود میں آئے، تو دوسری طرف وہ ایسی اجتماعی معاشیات کو فروغ دیتے ہیں جن سے انفرادی سیرت سازی کو تقویت ملے۔ اگر معاشرہ اجتماعی اخلاقیات کو تشکیل نہیں دیتا تو انفرادی اخلاق کو بھی فروغ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اگر نظامِ ارتفاقات کی تشکیل اس انداز سے ہو کہ عوام الناس کو ہر وقت فکرِ معاش دامن گیر ہو اور دن رات کے چوبیس گھنٹے نان شبینہ کے حصول میں ہی صرف ہو جائیں، انھیں اولاد کی تعلیم و تربیت کے وسائل میسّر نہ ہوں، رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اُن کا ذہن سوچ نہ سکے اور احباب و رفقاء کی دل داری کے لیے انھیں موقع نہ ملے تو عبادت اور تزکیۂ نفس کے لیے انھیں یکسوئی کیسے مل سکتی ہے؟۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسی لیے زندگی گزارنے کے تین طریقے بیان کیے ہیں اور اُس طریقۂ زندگی کو مطلوب قرار دیا ہے جو پیشِ نظر مقصود کے حصول میں ممد و معاون ہو:

۱۔ رفاہیت بالغہ، یعنی بے انتہا آسائش اور ہر قسم کے عیش و طرب سے مالا مال زندگی۔

۲۔ رفاہیت متوسّطہ، معتدل طرزِ زندگی، جس میں امیر اور غریب کے درمیان زیادہ خلیج نہ ہو۔

۳۔ رفاہیت ناقصہ، گھٹیا طرزِ زندگی۔

فاضل مصنف نے پہلی اور تیسری قسم کو نامطلوب قرار دیا ہے۔ پہلا طرزِ حیات مسرفانہ اور عیاشی کو دعوت دینے والا ہے، جب کہ تیسرا طرزِ زندگی انتہائی ناقص، گھٹیا اور چوپایوں کی زندگی کی مانند ہے۔ اس میں انسان اتنا درماندہ اور مفلوک الحال ہوتا ہے کہ جانوروں سے قریب ہوجاتا ہے۔ ۳۸ قرآن ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرنے پر زور دیتا ہے اور انبیائے کرام معتدل طرزِ حیات

ہی کو پسند کرتے ہیں:

''انبیائے کرام نے معتدل ارتفاق ہی کو اختیار کرنے کا حکم دیا کہ عجمی بادشاہوں کی طرح انسان عیش کوشی ہی میں نہ ڈوبا رہے اور نہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے والے قبائل کی وحشیانہ زندگی گزارنے کی سطح پر اتر آئے'' ۳۹

منہاجیاتِ قرآن کا انطباق:

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے نظریۂ ارتفاقات کی عمارت جن بنیادوں پر استوار کی ہے وہ قرآن ہی سے ماخوذ و مستنبط ہیں۔ درمیانِ بحث قرآن کریم کے حوالے نہیں ہیں، کیوں کہ وہ اسے عالمی اور انسانی نظریہ بنا کر اقوام عالم کے لیے قابل قبول بنانا چاہتے ہیں، مگر قدم قدم پر قرآن کریم کی روح بولتی محسوس ہوتی ہے۔ ہر فکر، اصول، طریقہ اور منہاجیات میں قرآنی آیات کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔

بین المذاہب مکالمہ کے لیے مشترک امور و مسائل سے آغاز کرنا قرآن کریم ہی کی تعلیم ہے۔ اہلِ کتاب کے تعلق سے ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوا إِلىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُم أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً (آل عمران:۶۴)

کہہ دو اے اہلِ کتاب اُس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں۔

دعوتِ دین کا یہ حکیمانہ طریقہ قرآن کا عطا کردہ ہے کہ اگر مخاطب سے گفتگو کے لیے کوئی مشترک بنیاد مل سکتی ہو تو اُسی پر بحث اور مکالمہ کو آگے بڑھایا جائے۔ اور خواہ مخواہ اپنی انفرادیت پر اصرار نہ کیا جائے۔ اہلِ کتاب آسمانی کتابوں کے حامل ہونے کی وجہ سے توحید کی تعلیم سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کی علم برداری کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ انھوں نے شرک کی راہ اپنے نبیوں اور صحیفوں کی تعلیمات میں تحریف کر کے اختیار کی تھی۔ اسی لیے قرآن نے اسی نقطہ سے گفتگو شروع کی اور پھر دھیرے

دھیرے اس کے تقاضے اور لوازم واضح کیے۔

اس دعوتی منہاج کا استعمال شاہ صاحب کے نظریۂ ارتفاقات میں پوری طرح نمایاں ہے۔

فاضل مصنف کا یہ استدلال کہ ارتفاق کا نظام فطری اور جبلّی ہے، قرآن کریم سے ماخوذ ہے۔ عمرانی و تہذیبی ارتقا کو فطرت کی پکار سے تعبیر کرنا قرآن کی درج ذیل آیت کی عملی تفسیر ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَالنَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ (الروم: ۳۰)

پس تم اپنا رخ یکسو ہوکر دین کی طرف کرو۔ اُس دین فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہاں قرآن نے دینِ اسلام کو دینِ فطرت کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کی صراحت کی ہے کہ یہ دین کوئی خارج سے تھوپی ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ عین تمہاری فطرت کا ظہور اور تمہارے اپنے باطن کی دولت ہے جو تمہارے دامن میں ڈال دی گئی ہے۔ اس قرآنی بیان سے یہ حقیقت الم نشرح ہوتی ہے کہ یہ نظریہ محض ذہن و فکر کا مغالطہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک کورا کاغذ ہے اور وہ خالصۃً اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ انسان کو اللہ نے بہترین ساخت اور بہترین فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اُس کے اندر خیر و شر اور نفع و ضرر کے درمیان تمیز کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ انبیائے کرام اس لیے تشریف لائے کہ سلیم الطبع لوگوں کو ہدایت کی راہ دکھائیں اور مبادیٔ فطرت کے تمام لوازم اور اس کے سارے تقاضوں کی تفہیم کریں، پھر قرآن نے دینِ اسلام کو ایک سیدھے دین کے طور پر پیش کیا جس کو انسان کی عقل اور اس کی فطرت کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ تقربِ الٰہی کے حصول کا یہ سیدھا اور سادہ راستہ ہے، اس میں کہیں کوئی ٹیڑھ اور کجی نہیں ہے۔[۴۰]

فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً (آل عمران: ۹۵) (ابراہیمؑ کی ملت کی پیروی کرو جو حنیف تھا)

وہ رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بھی پیش کرتے ہیں:

بُعِثْتُ بِالْمِلَّةِ السمحة الحنيفية البيضاء [۴۱] مجھے ایک ایسی ملت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے جو کشادہ ظرف، یکسو اور روشن ہے

اس حدیث کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں 'السمحة سے مراد یہ ہے کہ اس مذہب میں مشقت انگیز عبادت واطاعت نہیں ہے، جیسا کہ راہبوں نے ایجاد کرلیا تھا، بلکہ اس دین میں ہر عذر کے لیے رخصت موجود ہے۔ یہ دین طاقت ور اور کم زور، مصروف اور فارغ ہر ایک کے مناسب حال ہے۔ الحنيفية سے حضرت ابراہیم کی ملت مراد ہے البيضاء کا مطلب ہے کہ اس کے احکام، علتیں اور مقاصد سب واضح ہیں۔ غور وفکر کرنے والا ان کا ادراک کرسکتا ہے، بشرطے کہ وہ عقل سلیم کا مالک ہو اور ہٹ دھرم نہ ہو۔[۴۲]

شاہ صاحب نے نظام ارتفاق کو فطرت کے مطابق ثابت کرکے تمام اقوام و قبائل اور ادیان و مذاہب کے علم برداروں کو دعوتِ فکر وعمل دی اور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اس قرآنی منہاجیات کو نافذ کرنے کا راستہ بھی دکھادیا۔

آج جب کہ عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت، تشدد اور الزام تراشی کا ماحول ہے، اغیار کی ریشہ دوانیاں اور اپنوں کی جفا کیشیاں عروج پر ہیں اور بعض اسلام پسند افراد اور طبقات کی سادگی، سادہ لوحی اور بے بصیرتی رہزنوں اور ظالموں کے لیے وجہ جواز بھی فراہم کررہی ہے تو کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم ذرا ٹھہر کر اپنی دعوتی جدو جہد کا بے لاگ محاسبہ کریں اور قرآنی منہاجیات کی روشنی میں اجتہاد سے کام لے کر نئی راہیں نکالیں۔ خاص طور سے ہندوستان جیسے ملک میں جہاں چند فرقہ پرست عناصر اور ادارے اپنے سیاسی مفاد کے حصول کے لیے ہندوؤں کی بھاری اکثریت کو، جو امن پسند

اور روادار رہی ہے، مشتعل کر کے مذہب کے گورکھ دھندوں میں پھنسا کر اقلیت کے مقابلہ میں کھڑا کر دیتے ہیں اور نفرت و تصادم کے زہریلے بیج بو کر اپنے مفادات کی کاشت کرتے ہیں، کیا حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ ارتفاقات نئے رنگ روپ میں، مناسبِ حال اصطلاحات اور اسلوب میں از سرِ نو نافذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام اور ہندومت کی مشترک تعلیمات کو بنیاد بنا کر دو تہذیبوں کے درمیان ایک تاریخی مکالمہ کا آغاز کیا جائے اور اسلام کے بنیادی عقائد پر ثابت قدم رہتے ہوئے مشترک اقدار و روایات کے جلو میں ملک کی تعمیر و ترقی کی منصوبہ بندی کی جائے؟ کیا ہمارے علماء اور دانش ور ماضی قریب کی نفسیات سے مل کر مکالمہ بین المذاہب کی نئی روایت ڈالنا پسند کریں گے؟

اس دعوتی سفر میں قرآن کریم اور سنت رسول کو رہ نما بنانا ہوگا۔ دین فطرت کو عام فہم انداز میں ہندوستانی مزاج و نفسیات کو سامنے رکھ کر پیش کرنا ہوگا۔ کشادہ ظرفی، رواداری اور تحمل کو قومی کردار بنانا ہوگا اور بحیثیتِ مجموعی حدیث نبوی کے الفاظ میں ''الملة السمحة الحنيفية البيضاء'' میں اپنے آپ کو ڈھالنا ہوگا۔ اکیسویں صدی کسی اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے انتظار میں ہے اور ہندوستان کی مٹی ہمیشہ بڑی زرخیز اور مردم خیز رہی ہے، اس لیے اس کشتِ ویراں سے ناامیدی کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔ فهل من مجيب ؟!

تعلیقات و حواشی:

۱- انسان کی اجتماعیت پسندی و مدنیت پر فارابی بہت واضح انداز میں کہتے ہیں:

وكل واحد من الإنسان مفطورٌ علىٰ انه محتاج فى قوامه وفى أن يبلغ أفضل كمالاته إلىٰ اشياء كثيرة لايمكنه أن يقوم بها كلها هو واحده،بل يحتاج إلىٰ قوم يقوم لهٗ كل واحد منهم بشئ مما يحتاج إليه، وكل واحد من كل واحد بهٰذا الحال فلذلک لايمكن أن يكون الإنسان ينال الكمال الذى لأجله جعلت

لهٗ الفطرة الطبيعية إلا باجتماعات.

ابونصر محمد بن الفارابی، آراء أهل المدينة الفاضلة، ای جے برل، لائیڈن، ۱۸۹۵ء، ص ۵۳

۲- ابن منظور، لسان العرب، دار صادر، بیروت، مادہ رف ق، جلد ۱۰، ص ۱۱۸

۳- ندوی، سید ابوالحسن علی، تاریخ دعوت وعزیمت، جلد ۵، ص ۲۲۵

۴- دہلوی، شاہ ولی اللہ، البدور البازغہ، تحقیق: صغیر حسن المعصومی، حیدرآباد (پاکستان)، اکادیمیۃ الشاہ ولی اللہ الدہلوی، ۱۹۷۰ء، ص ۸۴

۵- نفس مصدر، ص ۶۲

۶- دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، مصر، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، ج ۱، ص ۴۰

۷- نفس مصدر، ۱/۴۰

۸- سندھی، عبید اللہ (مولانا)، محمودیہ، لاہور، مکی دارالکتب، ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۶

۹- البدور البازغہ، حوالہ بالا، ص ۶۹-۷۰ ۱۰- حجۃ اللہ البالغہ، حوالہ بالا، ج ۱، ص ۱۴، ۶۳

۱۱- شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں: وهذه الجماعات بذلك الربط هي المدينة في الحقيقة. وليست المدينة في الحقيقة أسماء للسور و السوق والحصن، حتى لو كان قرى متقاربة فيها جماعات يعامل بعضها بعضاً سمّينا ها مدينة ايضاً، والمدنية صارت بذلك الربط شيئاً واحداً، كل جماعة وبيت منهٗ يضاهي عضواً من أعضاء الواحد. البدور البازغہ، حوالہ بالا، ص ۹۱

۱۲- حجۃ اللہ البالغہ، حوالہ بالا، ۱/۴۴

۱۳- نفس مصدر، ص ۹۱۔ شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں: ولها وحدة البتّة فلا بدّ من حفظ هذه الوحدة علىٰ صحتها ثم تكميل منا فعها. التدبير الذى به توجد الصحّة وتكمّل هو الإمام في الحقيقة، وليس الإمام عندنا هو الشخص الواحد الإنسانى.

۱۴- نفس مصدر، ص ۹۳ ۱۵- نفس مصدر، ص ۹۳

۱۶- البدور البازغہ، حوالہ بالا، ص ۱۱۳-۱۱۴

۱۷- حجۃ اللہ البالغہ، حوالہ بالا، ۱/۴۱

۱۸- البدور البازغہ، حوالہ بالا، ص ۱۲۵

۱۹- دہلوی، شاہ ولی اللہ، تاویل الأحادیث، تحقیق غلام مصطفیٰ القاسمی، حیدرآباد (پاکستان)، اکادیمیۃ الشاہ ولی اللہ الدہلوی، ۱۹۸۸ء، ص ۷۹

۲۰- حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۸ ۲۱- نفس مصدر، ۱/۹

۲۲- دہلوی، شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، لاہور، المکتبۃ السلفیہ، ۱۹۵۱ء، ص ۱

۲۳- نفس مصدر ۲۴-نعمانی، شبلی، علم الکلام، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۹ء، ص ۹۲

۲۵- حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۸۰ ۲۶- نفس مصدر، ۱/۸۹

۲۷- البدور البازغہ، حوالہ بالا، ص ۲۶۵-۲۶۶ ۲۸- نفس مصدر

۲۹- دہلوی، شاہ ولی اللہ، إزالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، لاہور، سہیل اکیڈمی، ۱۹۷۶ء، ۱/۱۷۲

۳۰- حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۱۲۳ ۳۱-البدور البازغہ، ص ۲۴۰ ۳۲-نفس مصدر، ص ۲۴۲

۳۳- دہلوی، شاہ ولی اللہ، جمعات، تصحیح نور الحق علوی، حیدرآباد (پاکستان)، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ۱۹۶۴ء، ص ۸۹

۳۴- نفس مصدر، ص ۹۰ ۳۵- نفس مصدر، ص ۹۲

۳۶- حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۵۴ ۳۷- نفس مصدر

۳۸- البدور البازغہ، ص ۷۰

۳۹- حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۱۰۴۔ مصنف کے الفاظ یہ ہیں: الأنبیاء علیهم السلام أمروا بتعدیل الارتفاقات وأن لایبلغ بها حال المتعمّقین فی الرفاهیة کملوک العجم وأن لا ینزل بها الیٰ حال سکّان شواهق الجبال اللاحقین بالوحش.

۴۰- تفصیل کے لیے دیکھیے، اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، جلد پنجم، ص ۹۱-۹۳

۴۱- حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۱۲۷

۴۲- نفس مصدر، ۱/۱۲۸۔ امام بخاری نے اسی مفہوم کی ایک حدیث بیان کی ہے: أحبّ الدین الیٰ الله الحنیفیة السمحة، صحیح بخاری، کتاب الایمان، ۱/۲۳۔ ابن حجر عسقلانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "دین کی تمام خصلتیں پسندیدہ ہیں، لیکن اس کی جو باتیں آسان ہیں وہ اللہ کو زیادہ محبوب ہیں۔ یہاں دین کا لفظ بطور جنس کے استعمال ہوا ہے، یعنی تمام ادیان میں سب سے زیادہ پسندیدہ دین۔ ادیان کا مطلب تحریف و نسخ سے پہلے کی ماضی کی شریعتیں ہیں اور حنیفیت سے مراد ملتِ ابراہیمی ہے۔ علی متقی برہان پوری، کنز العمال، ۱/۱۷۸

☆☆☆